Rizwan Ullah
D-178, Abul Fazl Enclave-I
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel: +91-9971283786, 9891832189
Email:ruilmi@rediffmail.com
Web: www.Rizwanullah.com

تبصرہ

صدیقی سسٹرس کی کہانیاں اور پس منظر

رضوان اللہ

دختران عزیز سیما سلمہا، نائلہ سلمہا، بینا سلمہا اور گل سلمہا نے وہ ہجرت نہیں دیکھی جو طوفان نوح کی طرح ایک عظیم الشان اور مستحکم تہذیب کو خس وخاشاک کی طرح بہالے گئی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہماری تاریخ ہجرتوں کی تاریخ ہے لیکن تقریباً ساری ہجرتیں مغرب سے مشرق کی جانب ہوئیں۔ پہاڑوں کے سینے شق کرتی ہوئی ہوئیں، امواج بحر بیکراں کے سینے چیرتی ہوئی ہوئیں، لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے یہ پہلی ہجرتِ معکوس تھی جو مشرق سے مغرب کی جانب ہوئی۔ بہرحال ان بیٹیوں نے عالم مہاجرت میں آنکھیں کھولیں، اپنے اسلاف (یعنی والدین کے بزرگوں) کو نہیں دیکھا، ان کے وطن کی روح افزا ہواؤں میں سانس نہیں لی، وہاں کی نرم مٹی کی سوندھی مہک سے مشام جاں کو معطر نہیں کیا، وہاں کی ہریالی سے آنکھوں کو نورانی نہیں بخشی، اسلاف کی میراث نہ ان کے والدین ساتھ لے گئے نہ اپنی بچیوں کے لیے چھوڑ گئے لیکن شرافت نفس، دینداری اور علم ودانش کی روایات اوران کے مظاہران کی رگِ جاں اور روح ورواں میں سرایت تھے، ان بیٹیوں کی قلم وقرطاس سے ہم رشتگی اسی میراث نہفتہ کا حصہ ہے۔ وہ سارے عناصر نئی مٹی اور نئی آب وہوا میں پروان چڑھتے رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ”سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں“۔

چنانچہ ہماری بھانجیوں کی (یہ ہماری اہلیہ مرحومہ کی بھانجیاں ہیں) پانچ کتابیں موصول ہوئیں۔ ان میں سے دو کتابیں سیما کی ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک کئی سال پہلے موصول ہوئی تھی لیکن اس وقت میری وہ اعصابی اور روحانی آزمائش شروع ہوچکی تھی جو چار پانچ سال تک جاری رہنے کے بعد چند ماہ گزرے کہ انجام کار کو پہنچی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے بعد میں تنہا اور ذہنی طور پر مجہول ہوکر رہ گیا۔ جب حواس کچھ درست ہونے لگے تو ان کتابوں کا بھی خیال آیا۔ سوچا کہ کم سے کم ان کتابوں کی رسید تو لکھ دوں سو یہ تحریر اسی کوشش کا حصہ ہے۔

ان بیٹیوں کے نانا سید محبّ الحق محشرؔ حسینی کا تعلق ضلع بلیا (یوپی) کے موضع چندائر کے ایک ممتاز اور خوشحال

زمیندار گھرانے سے تھا۔ انھوں نے دینی علوم سے فراغت کے بعد خدمت خلق کے طور پر طبابت کو اختیار کیا جو ایک اچھی مصروفیت بھی تھی چنانچہ وہ اطراف و دیار میں حکیم جی کے طور پر مشہور تھے۔ موروثی طور پر حاصل ہونے والی فراغ دستی اور خوشحالی نے انھیں کسبِ معاش کے لیے تگ و دو سے بے نیاز رکھا تھا۔ ساری علمیت کے باوجود لکھنا لکھانا ہر کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔ ’’ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ‘‘۔ مبدائے فیض نے مولانا موصوف کو اس دولت سے خوب خوب نوازا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ادب کی تقریباً تمام اصناف میں جواہر پارے پیش کیے۔ دینی مضامین نظم و نثر دونوں ہی اصناف میں لکھتے رہے جو دارالمصنّفین، اعظم گڑھ کے ’’معارف‘‘ جیسے جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر سنجیدہ اور طنز و مزاح کے رنگ میں بھی مضامین لکھتے رہے۔ مجھے اپنی ابتدائی زندگی میں موصوف کی تحریروں کے محض چند نمونے دیکھنے کو ملے کیونکہ ہمارے درمیان فصلِ زمانی اور فصلِ مکانی دونوں ہی حائل تھے۔ لیکن ان تحریروں سے ان کی ادبی کاوشوں کی وسعتوں کا اندازہ تو ہو ہی گیا۔ موصوف کی عمر نے وفا نہ کی اور جواں عمری میں ہی آغازِ مہاجرت سے ٹھیک ایک سال پہلے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے انھیں جون 1946ء میں اعظم گڑھ میں جہاں وہ زیر علاج تھے آخری بار دیکھا تھا۔ اگست میں ان کی وفات ہوئی۔ آں محترم میرے خسر بھی تھے۔

سیما کی پہلی کتاب ’’جن جنجال میں‘‘ 2015ء میں شائع ہوئی اس کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ نانا مرحوم (مولانا سید محبّ الحق محشرؔ حسینی) کے مضامین کا ایک مجلد مسودہ ان کے پاس ہے۔ اس کو شائع کرنا چاہیے تھا۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ مرحوم کی تخلیقات کچھ نہ کچھ مختلف عزیزوں کے ساتھ چلی گئی ہوں گی حالانکہ وہ سب ایک افراتفری اور بے سروسامانی کی حالت میں گئے اور وہاں بھی ایک عرصہ تک اسی بے سروسامانی کی حالت میں گزارے۔ ایسے میں غیر ضروری چیزوں کے بچے رہنے کا امکان کم ہی ہوا کرتا ہے۔ تاہم قیاس ہے کہ شاید محبوب خزاںؔ اور ان کے بڑے بھائی محمد ایوب صدیقی مرحومین کی کتابوں وغیرہ میں مولانا مرحوم کا کچھ کلام بھی موجود ہو کیونکہ ان بھائیوں کو شعر و شاعری سے خاص شغف تھا۔ محبوب خزاں معروف تنقید نگاروں میں سے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ’’اکیلی بستیاں‘‘ مجھے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان بھائیوں کی ہمشیرہ محترمہ صالحہ صدیقی ان بیٹیوں کی بڑی اماں ہیں ماشاء اللہ سنچری بنانے کی طرف گامزن ہیں۔ سنا ہے کچھ عرصہ ہوا ان کی غزلوں کا ایک انتخاب شائع ہوا ہے۔

نور چشمیوں کی حسب ذیل کتابیں مجھے موصول ہوئی ہیں۔ سیما کی پہلی کتاب ’’جن جنجال میں‘‘ اس میں 16 کہانیاں ہیں۔ ان کی دوسری کتاب ’’گیدڑ بھبکیاں‘‘ اس میں 18 کہانیاں ہیں۔ نائلہ کی کتاب ’’پڑیئے گر بیمار‘‘ میں 17 کہانیاں ہیں۔ بینا کی کتاب ’’خاطر داریاں‘‘ میں 18 کہانیاں ہیں اور گل کی کتاب ’’مجرم کے بال‘‘ میں 22 کہانیاں ہیں۔ یہ کل ملا کر 91 کہانیاں ہیں یعنی سنچری میں صرف نو کی کمی ہے۔ یہ چاروں قلم کار بہنیں صدیقی سسٹرس کہلاتی ہیں اور ایک عرصہ سے لکھتی اور چھپتی رہی ہیں۔ ان کی کہانیاں ہوا کے دوش پر بھی سوار ہوتی رہی ہیں۔

زیرِ نظر کتابیں ادبِ اطفال میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں بیشتر کہانیاں بچوں سے متعلق ہیں اور بڑوں سے متعلق بھی۔ بچوں کے پڑھنے کی ہیں اس سے زیادہ بڑوں کے پڑھنے کی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آج لوگوں کو بات کرنے اور بات سننے کی بھی فرصت نہیں ہے تو کتابیں کیا اور کب پڑھیں گے تاہم ہر موضوع پر دنیا بھر کی زبانوں میں پہلے سے زیادہ کتابیں لکھی جارہی ہیں اور میڈیا کے طوفان کے باوجود اخبارات پہلے سے زیادہ چھپ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کتابوں میں شامل کہانیوں میں سے بیشتر ہوا کے دوش پر سوار ہوکر نوائے سروش کی طرح بچوں اور بڑوں سب کے لیے فردوس گوش وہوش ہوچکی ہوں گی۔ چنانچہ یہ ان قلم کاروں کی دوہری فصل ہے۔

اب کچھ ان تحریروں کے بارے میں۔ ان کی زبان اور طرزِ بیان کے متعلق کچھ کہنا سعی لاحاصل ہے۔ کیونکہ یہ سب تو ان کو بطورِ میراث خفی حاصل تھا صرف ان کے نمو پذیر ہونے اور پردۂ غیب سے باہر آنے کی دیر تھی۔ یہ قلم کار جس تہذیب کی وارث ہیں اس کے سارے انتشار اور بکھراؤ کے باوجود اردو زبان کے طفیل اس کا تسلسل باقی ہے۔ ان کے حصے میں اتنی خوش قسمتی ضرور آئی کہ ان کا کنبہ ہر حال میں مجتمع رہا اور ان کے اجڑے ہوئے معاشرے کے بیشتر اعضاء قرب وجوار کی نئی بستیوں میں سکونت پذیر ہوئے۔ چنانچہ معاشرتی سطح پر ہر طرح کا لین دین جاری رہا ان میں رسم ورواج، زبان کے محاورے اور روزمرہ بھی تھے، تجربات اور مشاہدات بھی، قصے کہانیاں بھی یہ سب ان کہانیوں میں موجود نظر آتے ہیں اور وہ نئے اور پرانے معاشرے، ماضی وحال پر ایک بیش بہا کڑی ہیں جنھوں نے سابقہ روایتوں کو زندہ رکھا ہے۔

مثال کے طور پر یہاں ایک کہانی میں کسی کے سر پر سینگ نکلنے کا تذکرہ ہے۔ ہم نے بھی اپنے بچپن میں سنا تھا کہ کسی راجہ کے سر پر سینگ نکل آئے تھے۔ حجامت کے لیے بہت پریشان تھا بالآخر ایک حجام کو اس شرط کے ساتھ حجامت بنانے کا حکم دیا گیا کہ وہ کسی سے کہے گا نہیں۔ لیکن وہ بیچارہ بہت پریشان ہوا اس کا پیٹ پھولنے لگا تو اس نے ایک کنوئیں میں جھانک کر کہہ دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ جب بھی کوئی اس کنوئیں سے پانی نکالنے جاتا تو اس میں سے آواز آنے لگتی ”راجہ کے سر پر دو سینگ۔ کن نے کہا کن نے کہا بن حجام نے۔“

اسی طرح ایک آسیب زدہ گھر کی کہانی ہے۔ جب اس میں رہنے والا عاجز آ گیا تو اس نے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ ”جب سامان لاد کر جانے لگا تو ایک طوطا آ کر سامان کے اوپر بیٹھ گیا اور چہک چہک کر کہنے لگا: اب ہم نئے گھر میں جارہے ہیں۔“ وغیرہ وغیرہ۔

ہر زندہ زبان اپنے دوران سفر میں ہر پڑاؤ پر کچھ لین دین کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے چنانچہ اس کا بنیادی ڈھانچہ برقرار رہتے ہوئے بھی اس میں علاقائی اور مقامی اجزاء شامل ہوتے جاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے وقت اور زمانوں کے جو اثرات انسانی بود و باش اور ان کے طور طریقوں پر مرتب ہوتے ہیں اصناف ادب میں ان کی عکاسی ہوتی ہے۔ ایسا ہونا ضروری بھی ہے ورنہ وہ ادب بے وقت ہوجائے گا۔ چنانچہ یہ سب ان کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے جو اس حقیقت کی عکاس ہیں کہ یہ ساری تحریریں وقت سے، زمین وزماں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور ”تازہ واردان“ کو ماضی سے آشنا کرتی ہوئی بڑھتی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے ان کہانیوں میں یہ اقدار مشترک ہیں لیکن

ہر قلم کار کا طرزِ نگارش اس کے مزاج اور زاویہ نگاہ کے مطابق مختلف ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ان بہنوں کی تحریروں میں بھی وہ فرق نظر آتا ہے۔ کہیں سیدھا اور صاف بیانیہ ہے کہیں طنز و مزاح کے چھینٹے ہیں۔ یہ عناصر سیما کی تحریروں میں نسبتاً زیادہ ہیں، اس کے لیے سماج کے غائر اور باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد اس کو ہضم کر کے اپنی زبان میں پیش کرنا ہوتا ہے یہیں تیر و نشتر کی شدت کے ذریعہ یا تھپکیوں سے آگاہی دینے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہیں قلم کار کے مزاج، افتادِ طبع کا اندازہ اس کے الفاظ اور محاورات کے انتخاب سے کیا جا سکتا ہے۔

سیما کو اس فن میں کمال کا ملکہ حاصل ہے انھوں نے ہلکے پھلکے اشاروں میں اپنی بات کہہ دی ہے کہیں ان محاوروں سے بھی کام لیا ہے جو اس زبان کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے نئی بستیوں اور نئی نسلوں تک پہنچتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی ہلکی پھلکی چٹکیوں کا جو نشانہ ہوتا ہے اسے دانت کی اس ٹیس کا لطف آتا ہے جسے دبانے میں بھی مزہ آتا ہے۔

گل رعنا کی کہانیاں اپنی تینوں بہنوں کی اوریجنل کہانیوں سے مختلف ہیں۔ یہ انگریزی کہانیوں کا ترجمہ ہیں۔ ان کی کتاب میں شامل 22 کہانیوں کے لیے گل رعنا نے معلوم نہیں کتنی کہانیوں کو پڑھا ہوگا۔ اس کے بعد اس انبوہ میں سے ان کہانیوں کا انتخاب کیا ہوگا۔ یہ تو اس پوری تصنیف کا پہلا اور کافی طویل مرحلہ رہا ہوگا۔ اس کے بعد زیادہ مشکل مرحلہ ان کہانیوں کے ترجمہ کا آتا ہے۔ بات صرف ترجمہ کی نہیں ہے بلکہ یہ کہ اسے کس طرح کی زبان میں پیش کیا جائے جس سے ان کہانیوں کا مخاطب یا قاری مانوس ہو۔ یہ کام کتنا مشکل ہے اس کو تو لکھنے والے ہی جانتے ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک بات ضرور ہے کہ اب ہماری تہذیب میں بھی کم و بیش وہ شہریت آتی جا رہی ہے جو عالم گیر ہے معاشرے میں زیرِ استعمال اور برتے جانے والے سامان تقریباً آفاقیت اختیار کر چکے ہیں عام لوگوں کی رہائشوں میں بھی یکسانیت آتی جا رہی ہے اور اسی اعتبار سے معاشرت اور طرزِ حیات میں یکسانیت آتی جا رہی ہے مثال کے طور پر بچوں کے اسکول وہاں کی نصابی تعلیم اور غیر نصابی معمولات مثلاً اسپورٹس اور پکنک وغیرہ میں بڑی یکسانیت ہے جس کی وجہ سے ان کے رویوں میں بھی بڑی مماثلت ہوتی جا رہی ہے۔ گھروں میں بھی ٹی وی، فریج اور استعمال کی دوسری چیزوں، لباس، پوشاکوں میں یکسانیت سے بڑھ کر عالمگیریت آتی جا رہی ہے اس لیے ان انگریزی کہانیوں میں جن حالات کا اور جن چیزوں کا تذکرہ ہے وہ غیر انگریزی داں قاری کے لیے کچھ نامانوس نہیں ہوں گے۔

جہاں تک کہانیوں کے اصل تانے بانے کا تعلق ہے ظاہر ہے معاشروں کے مطابق ان میں فرق ضرور ہوگا۔ تاہم ایک دلچسپ مشاہدہ یہ ہے کہ کہانیاں مشرق کی ہوں یا مغرب کی ان میں کہیں کہیں غیر مرعی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مثلاً جن بھوت وغیرہ کی کافرمائی یا رہائشوں کا آسیب زدہ ہونا۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے گھروں میں مٹی کے برتن ٹوٹتے پھوٹتے تھے اب چینی اور شیشے کے برتن ٹوٹتے ہیں۔ پہلے چھینکے پر رکھی ہوئی چیزیں بچے یا جن اڑا لیا کرتے تھے اب فریج میں سے کھانے پینے کی چیزیں غائب ہوتی ہوں گی۔

بینا اور نائلہ کی کہانیوں میں آئے دن گھروں میں ہونے والے واقعات اور چھوٹے بڑے بچوں کے

درمیان ہونے والے ہڑبونگ اور چھین جھپٹ کی بازدید یا بازخوانی کا لطف آتا ہے، ہر کسی کو اپنے گھر کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ رہی آسیبی عناصر کی کارفرمائی تو ہمارے یہاں پرانے مکانوں میں اس طرح کے قصے سنے جاتے تھے معلوم نہیں نئے سماج اور نئی بستیوں میں ایسے مکانات ہیں یا نہیں۔ ان کہانیوں سے تو ان کے ہونے کا اندازہ ملتا ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک پلاٹ ۳۵-۴۰ برس خالی رہنے اور کئی ہاتھوں فروخت ہونے کے بعد اب اس پر ایک کئی منزلہ عمارت تعمیر ہوئی ہے لیکن ابھی اس میں کوئی رہنے والا نہیں آیا ہے۔ ذرا آگے اسی طرح کا ایک پلاٹ عرصہ تک خالی رہا اس کے بعد اس پر ایک مکان کی تعمیر ہوئی وہ بھی اب تک خالی ہے کئی ہاتھ بک چکا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟

ان دونوں بہنوں کی کہانیوں میں ایک طرح کی مماثلت یا یکسانیت ہے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ وہی گھریلوپن، بچوں کی شرارتیں اور حکایتیں اور غیر مرئی عناصر کی کارفرمائیاں بھی جو تقریباً ہر کتاب میں نظر آتی ہیں۔ شاید کچھ چٹخارے کے لیے ایسا ضروری خیال کیا جاتا ہو۔ بینا کی کہانی ''الف کی طرح سیدھی اردو' رہِ عام سے ذرا ہٹ کر ہے۔ اسکول اور پکنک والی لائن میں ہے۔ پڑوسیوں اور مہمانوں کے بھی اچھے خاصے تذکرے ہیں۔ ان کی عنایتوں اور تشریف فرمائیوں کے قلیل المدت اور طویل المدت، انفرادی اور تکثیری ہر طرح کے نوع بہ نوع تجربے ہمیں اور گھر بھر کو اچھے خاصے ہیں دہلی میں رہنے کے یہ ضمنی فائدے ہیں۔

ان بیٹیوں کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ اپنی بات یہیں ختم کرنا چاہتا ہوں۔

امریکہ میں منتخب عہدے

اگرچہ امریکہ میں واحد وفاقی حکومت ہے لیکن اس میں حسبِ ذیل شامل ہیں

۵۰ ریاستی حکومتیں

۳ لاکھ سے زیادہ عہدے مقامی حکومتوں کے (کاؤنٹی، سٹی اور ٹاؤن کی)

اور تقریباً ۲ لاکھ مخصوص مقاصد کے اضلاع جیسے کہ اسکولی اضلاح، پانی کے اضلاع، نتیجے کے طور پر امریکی ووٹروں کو صرف صدر اور کانگریس (پارلیمنٹ) کے لیے نہیں ووٹ دینا ہوتا ہے بلکہ ریاستی اور مقامی حکومت کے ہزاروں عہدیداروں کے لیے بھی ووٹ دینا ہوتا ہے جن میں ریاستی قانون ساز ممبر، ریاستی گورنر اور لیفٹیننٹ گورنر، ریاستی آڈیٹر، کاؤنٹی کمشنر، ٹاؤن اور سٹی میئر، ایلڈرمین، جج، کانسٹبل، مجسٹریٹ، شریف، جسٹس آف پیس اور اسکول بورڈ، کالج بورڈ، یوٹیلٹی بورڈ کے ممبران اور عوامی ٹرسٹ کے عہدیدار شامل ہیں۔

کچھ غیر معمولی قسم کے منتخب عہدے بھی ہیں جیسے کاؤنٹی کورونر، آبپاشی اضلاع اور ٹاؤن سمٹری کمیشنوں کے ممبر اور درختوں کے وارڈن یعنی وہ افسران جو شہری املاک پر مخدوش درختوں کو ہٹانے کی نگرانی کرتے ہیں۔